ڈاکٹر سلیم اختر

صوت، لفظ اور زبان: بنیادی مباحث

In this article the origin of language has been traced in the perspective of mythology, Old Testament, Antique Civilization, Al-Quran, The Rig Vade and the modern phonology. This point has been stressed that the origin of language is based on the sounds which are articulated by the tools of speech, thus simple sounds uttered by the mouth, lips and throat ultimately turn into sophisticated language of creativity. That is why the language has been deemed to be the gifts of gods and the Greeks had to invent the "MUSES" to understand the amazing uses of language in poetry, drama and other genres of literature.

زبان کیا ہے:

بائبل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے ''Logos'' (لفظ/کلام) کہا۔ قرآن مجید میں ''الکتاب'' اور ''القلم'' کہا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت محمد ﷺ کو غار حرا میں اولین درس ''اقرا'' کی صورت میں ملا۔ یہودیوں میں تحریر کو حضرت یوشع کی عطا بتایا گیا تو ہندو اساطیر میں فنون لطیفہ اور ادب و شعر کی سرپرست دیوی سرسوتی ہے۔ اسی طرح دیگر ممالک کی اساطیر میں زبان، تحریر اور تخلیقات کے لیے سرپرست دیوتا اور دیویاں مقرر کی گئیں۔

سوال یہ ہے کہ زبان (اور اس کے تخلیقی مظاہر) کو اساطیری رنگ کیوں دیا گیا تھا؟ اور پھر اسی تناظر میں تخلیق کا رشتہ آسمان سے جوڑا گیا؟

دراصل بچہ افراد کنبہ اور گھر، کمرا اور محلہ کے ذریعے سے زبان تو شعوری کاوش سے سیکھ لیتا ہے۔ لیکن اس کا تخلیقی فعل انفرادی صلاحیتوں سے مشروط ہوتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ ایک زبان بولنے والوں میں صرف استثنائی مثالیں ہی تخلیق کے چبوترے پر قادی ہوتی ہیں اسی لیے مرکز نگاہ بنتی اور حریدۂ عالم پر اپنا نام ثبت کرتی ہیں۔ اگر ہر گھر میں ایک غالب پیدا ہو، گلی اقبالوں سے بھری ملتی تو آج غالب اور اقبال کا کوئی نام بھی نہ لیتا۔

بچہ جب غوں غاں کر رہا ہوتا ہے تو دراصل وہ اپنے آلات صوت کو مستقبل کی صوتی ادائیگیوں کے لیے تیار کر رہا ہوتا ہے۔ حرف، لفظ، جملے، فقرے تحریر تخلیق اساسی صورت میں اب ہوا ہے جو آلات صوت کی مدد سے مختلف ''لہروں'' (Waves) کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ آلات صوت سے بننے والی ''لہریں'' تمام انسانوں میں اسی بنا پر مشترک ہوتی ہیں کہ عضوی طور پر تمام انسان یکساں ہیں، البتہ جغرافیائی حالات کی وجہ سے آلات صوت بعض اصوات کی ادائیگی کے اہل نہیں ہوتے اسی لیے زبانوں میں جزوی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ہم دوسری زبان اس لیے نہیں سمجھ سکتے کہ الفاظ کے معانی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ جہاں تک اصوات کا تعلق ہے تو وہ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہوتیں۔

اگرچہ غیر مستحکم قیاس ہے لیکن پھر بھی اس پر غور کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام زبانوں کے الفاظ ختم کر دیے جائیں اور صرف

اصوات اپنی خالص ترین صورت میں باقی رہ جائیں تو زبانوں کی اجنبیت ختم ہو جائے گی۔ اسی سے اس نظریہ کو بھی تقویت ملتی ہے کہ ابتدا میں صرف ایک ہی زبان تھی۔ اولادِ آدم ہونے کے لحاظ سے بھی یہ قرینِ قیاس ہے۔ ابتدا میں دنیا چھوٹی تھی، زندگی غیر دلچسپ اور آبادی محدود۔ بقدرِ ضرورت ایک ہی زبان سے کام چلا لیا جاتا ہوگا۔ ایسی زبان جس کا ذخیرۂ الفاظ خاصہ محدود ہو گا جس میں ماحول، جانوروں اور اشیاء کے محدود الفاظ ہوں گے اور جن میں (غالباً) مجرد تصورات کے لیے مخصوص اصطلاحات کا فقدان ہوگا۔ ''Lingua Adamica'' کی اصطلاح زبانِ آدم کے لیے مخصوص ہے۔ جیسے نسلِ آدم پھیلتی گئی ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا۔ مختلف نسلوں کے آلاتِ صوت کی جداگانہ صوتیات کی بنا پر الفاظ کی ادائیگی کی مختلف صورتیں بنتی گئیں اور یوں زبانوں کے خاندانوں اور ان سے وابستہ بولیوں اور زبانوں کا آغاز ہوگیا۔

''عہد نامہ عتیق'' کے بموجب بابل میں جو لوگ ایک بلند مینار تعمیر کر رہے تھے اس سے حادثہ پیدا ہوا کہ یہ بلند مینار کے ذریعہ آسمان تک رسائی حاصل کرلیں گے۔ چنانچہ ان میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ان کی زبانیں الگ الگ کر دی گئیں۔ یوں وہ اس ایک دوسرے سے الگ ہو کر علیحدہ بستیوں میں زندگی بسر کرنے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں میں اتنی مغائرت پیدا ہوگئی کہ ایک زبان کا دوسری سے کوئی تعلق ہی نہ رہا۔

قرآن مجید میں زبانوں کے ضمن میں ارشاد ہوا:

''آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اور زبانوں اور رنگوں کے اختلافات اللہ کی نشانیاں ہے۔''

اگر یہ سوال کیا جائے کہ قدیم دنیا کے باشندے کون سی زبان بولتے ہوں گے تو ماہرین اس کا قطعی جواب دینے سے قاصر ہیں۔ حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان کے زمانے اور زبانوں کے بارے میں تو کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ زندگی اور آثار طوفانِ نوح میں ملیامیٹ ہوگئے۔

حضرت نوحؑ کا بیٹا سام تھا جبکہ آرام حبلام اور آشور سام کے بیٹے تھے۔ سام سے ''سامی'' بنی، آرام کی نسل جو پورے سعودی عرب اور یمن کے علاقوں میں آباد تھی، سوان کی زبان ''آرامی'' کہلائی۔ آشور کی نسل شام میں پھیلی اور ان کی زبان ''سریانی'' تھی (شام کا قدیم نام سوریا تھا، اسی مناسبت سے سریانی نام ہوا)۔ جبکہ عابر کے نام پر (یہودیوں کی زبان) عبرانی بنی۔ تباہ ہونے سے پہلے بابل میں جو زبانیں مروج تھیں وہ کئی ہزار برس قبل مسیح کی تھیں جو استدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی گئیں۔

قدیم زمانہ میں دنیا اتنی وسیع اور پر تنوع نہ تھی، چھوٹی چھوٹی تہذیبیں اور ان کے محدود اثرات ایک خطہ یا تہذیب کی زبان صرف اس خطہ یا تہذیب ہی سے مخصوص ہوتی تھی۔ ذرائع آمدورفت کی دشواریوں کی بنا پر عام افراد کے میل ملاپ برائے نام۔ اس لیے تہذیبی اور لسانی اثرات بے حد محدود، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تہذیب کے خاتمہ کے ساتھ اس کی تہذیب، ثقافت اور زبان بھی بعض اوقات معدوم ہو جاتی تھی۔

زبانوں کا برِ اعظم:

ہندوستان اپنی وسعت میں کسی برِ اعظم سے کم نہیں، یہی نہیں بلکہ تہذیب، ثقافت اور زبان کے لحاظ سے (ماضی میں) اس کے مختلف خطے ایک طرح سے آزاد اور خود مختار تھے، اگرچہ یہ مختلف خطوں کی زبانوں جیسے بنگلا، تامل، تیلگو، پنجابی، مراٹھی، سندھی، کنڑی، ملیالم وغیرہ نے اپنا انفرادی تشخص تو برقرار رکھا مگر پورے ملک میں رابطہ کا ذریعہ بننے والی کوئی زبان نہ تھی۔ یہ کردار اردو نے ادا کیا۔ اور بطریق احسن ادا کیا۔

اردو کی تشکیل اور صورت پذیری کی داستان کا مطالعہ اسی بنا پر بے حد دلچسپ ہے کہ یہ صدیوں کے تہذیبی اور ثقافتی رویوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ فارسی، عربی، ترکی اور مقامی زبانوں کے امتزاج سے جس زبان نے جنم لیا وہ وحدت میں کثرت کی مظہر ثابت ہوئی۔

زبان کیوں؟

سوال یہ ہے کہ زبان کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ آخر انسان زبان کا کیوں محتاج ہے؟ اور ان سوالات سے پیوستہ یہ سوال کہ زبان کا آغاز، تشکیل اور صورت پذیری کن عوامل کی مرہونِ منت قرار پاتی ہے؟

اسی نوع کے دیگر سوالات کا سیدھا سا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ انسان زبان اختیار کرنے پر مجبور تھا اور ہوتا ہے۔

انسان کی اولین زبان گنتی کے چند الفاظ تک محدود ہوگی اور یہ وہ زبان ہوگی جس سے آدم نے حوا سے کلام کیا ہوگا۔ جنت خوش منظر تھی، کھانے کو وافر مقدار میں سامانِ خورد و نوش میسر، کرنے کو کسی کام، محنت اور سعی کی ضرورت نہ تھی تو آدم و حوا ہر وقت بیٹھے ایک دوسرے کی صورت تو نہ دیکھتے رہتے ہوں گے، لہٰذا وہ کسی نہ کسی طرح کے الفاظ تو استعمال کرتے ہی ہوں گے، خواہ گنتی کے چند الفاظ ہی کیوں نہ ہوں۔ بس گنتی کے یہ چند الفاظ ہی دنیا کی سب سے پہلی زبان کا آغاز قرار پاتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ (قرآن مجید اور عہد نامہ عتیق کے بموجب) خدا نے آدم کو تمام اشیاء اور چرند پرند سب کے نام سکھائے۔ یہ نام سیکھنا ہی زبان کی اساس اور آغاز ہے۔ گویا زبان کی اساس آسمانوں پر استوار ہوئی۔

ذرا غور کیجئے آدم گہری نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اپنے پہلو میں ایک نئے وجود کو پاتا ہے جو اُس سے مشابہت رکھتا ہے اور کچھ مختلف بھی ہے۔ مگر ہے جاذبِ نظر! پہلی مرتبہ حوا کو دیکھنے پر آدم کی زبان سے کلمۂ استعجاب یا کلماتِ تحسین بلند ہوتے ہیں۔ وہ حوا سے کلام کرتا ہے، حوا جواب دیتی ہے تو انہوں نے کون سے الفاظ استعمال کئے ہوں گے اور پھر سانپ حوا کو بہکاتا ہے تو اس نے اس مقصد کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہوں گے، وہ کہاں سے حاصل کئے؟ حوا نے کس اسلوب میں آدم کو ترغیب دی، چوری پکڑے جانے پر کس انداز میں طالبِ عفو ہوئے اور کن الفاظ میں ندامت اور پشیمانی کا اظہار کیا اور اس سلسلے کا آخری سوال جب دونوں زمین پر آئے تو کیا وہ آسمانی زبان ہی استعمال کرتے رہے یا دنیا کے تقاضوں سے عہدہ برا ہی کے لیے نئی زبان وضع کی۔

میں نے جب اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے مطالعہ کیا تو پایا کہ ہر علاقہ کے لوگوں نے اپنی ہی زبان کو جنت کی زبان بتایا اور اس ضمن میں عربی، سریانی، عبرانی، فرانسیسی، ڈینش، سویڈش، ڈچ وغیرہ کے نام لئے گئے (اس ضمن میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ کیجئے راقم کی تالیف ''اُردو زبان کیا ہے'')۔

آدم ہی کی مثال کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جب تک آدم تنہا رہا اسے کلام کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو گی۔ تنہا انسان زیادہ سے زیادہ خود کلامی کرسکتا ہے جو ذہنی عمل ہے۔ جیسے ہی دوسرا ساتھی ملا مکالمہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

آدم کی مثال سے زبان کے آغاز کو سمجھا جاسکتا ہے۔ زبان سماجی ضرورت ہے اور عمرانی روایت کی مظہر، انسان اگر کسی بوتل میں بند زیست کرتا تو اسے زبان کی ضرورت نہ ہوتی لیکن جیسے ہی وہ دوسرے فرد یا افراد کے سامنے آتا ہے تو اظہارِ مطالب کے لئے اسے زبان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ فرد اپنا اظہار جانتا ہے اور افراد کے اظہار کو سمجھنا جانتا ہے۔ سیدھے الفاظ میں یہی زبان کی ضرورت ہے اور یہی اس کا آغاز۔ حرف کیسے ساخت ہوا، الفاظ کس طرح معرضِ وجود میں آئے، الفاظ کس طرح سے فقروں کی مالا میں پروئے گئے اور فقرے کیسے تخلیق کے گلدستہ میں تبدیل ہوئے۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں سیدھی سی بات یہ ہے کہ زمین پر اس لئے زبانیں ہیں کہ انسان ہیں چاند یا مریخ پر زبانوں کی ضرورت نہیں۔

جن زبانوں نے انسان کی سماجی ضرورتوں کے تحت اظہار و ابلاغ کے لئے جنم لیا وہ اب اپنی ابتدائی اور سادہ ترین صورت میں نہیں رہیں بلکہ اب اس نے وسیع اور پیچیدہ علم کی صورت اختیار کرلی ہے۔

وہ زبان جو کبھی ایک پودے کی مانند ہوگی اب گلشن میں تبدیل ہو چکی ہے۔ زبان کے گلشن کی تزئین کے لئے لغت، صرف، نحو، صوتیات جیسے انفرادی علوم وضع کئے جاچکے ہیں، جبکہ لسانیات بھی متعدد شعبوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

زبان، اس کے آغاز، ماہیت، اصوات اور الفاظ کے حوالے سے اب متعدد علوم نظریات اور داستان معرض وجود میں آ چکے ہیں۔ آدم حوا کو دیکھ کر جس استعجاب یا تحسین کے لئے لب کشا ہوا تھا وہ زبان بلکہ زبانوں میں تبدیل ہو کر" Kladeo Scopic Dimensions" کا حامل بن چکا ہے۔

زبانوں کا علم:

انسان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ سوال کرتا ہے۔ ایسے سوالات جن کے ذریعہ سے اس نے اگر ایک طرف خود کو سمجھنے کی کاوش کی تو دوسری طرف اپنے گرد و پیش اور ماحول کو۔ اور ساتھ ہی مادی دنیا سے ماورا کو بھی۔ دیکھا جائے تو تمام علوم اور فلسفہ ان ہی سوالات کے باعث معرض وجود میں آئے۔ اگر انسان محض جہلت کا تابع ہو کر زیست کرتا رہتا تو آج بھی وہ دیگر جنگلی جانوروں کے ساتھ جنگل میں ہی ہوتا، جب اس نے اپنے جسم، جان، وجود، ذات، صفات اور روح کے بارے میں سوالات کیے تو ناممکن تھا کہ وہ اپنی زبان کے بارے میں استفسار نہ کرتا اور اظہار، ابلاغ کے سب سے بڑے اور مؤثر ذریعہ (یا پھر آلہ) کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ اس نے زبان اور اس کے متعلقات کو سمجھنے کی کوشش کی اور نتیجتاً اس علم نے جنم لیا جو اب لسانیات (Philology) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انگریزی کی لاتعداد علمی، سائنسی اور ادبی اصطلاحات کی مانند Philology بھی یونانی زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ Philo محبت، الفت اور چاہت کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ Logy لفظ اور علم کے لئے۔ لہٰذا Philology کا مطلب ہوا زبان کی محبت۔ اُردو میں اس کے لئے عربی لفظ لسان کی مناسبت سے لسانیات کی اصطلاح مروج ہے۔

ماہرین کے بموجب Philology کے لیے علم زبان/علم اللسان درست ہے، اسے لسانیات کہنا غلط ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ لسانیات کی اصطلاح مقبول ہو گئی اور اب یہی مستعمل ہے۔

لسانیات کی سادہ اور مختصر ترین تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ زبان کے آغاز، تشکیلی مراحل اور ساخت کو سمجھنے کا علم ہے۔ ابتدا میں لسانیات ان ہی امور کا جائزہ لیتی تھی اور عمومی (General) اور اطلاقی (Applied) میں دو شعبوں میں منقسم تھی۔ عمومی لسانیات میں زبان، اس کی تشکیل، ساخت وغیرہ کے بارے میں اصول و ضوابط وضع کیے جاتے تھے، جبکہ اطلاقی لسانیات میں ان اصولوں کی روشنی میں مروج زبان، مثالوں اور دیگر ادبی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔

تقابلی لسانیات کی صورت میں نئے شعبہ کی تشکیل ہوئی۔ اس میں دو یا دو سے زائد زبانوں کے تشکیلی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ایک زبان پر دوسری زبان کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ایسا مطالعہ تاریخی حالت، کوائف کو پیش نظر نہیں رکھتا لیکن اگر زبان کے مطالعہ میں تاریخی تناظر بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اسے تاریخی (Historical) لسانیات کہا جاتا ہے اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ مطالعہ زبان میں اس سے کلی صرف نظر ممکن نہیں اس لئے لسانیات کے دیگر شعبوں میں بھی کسی نہ کسی طرح تاریخ کا مطالعہ شامل ہو جاتا ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے جب ہم دکن میں اُردو زبان کی تشکیل اور صورت پذیری کا مطالعہ کرتے ہیں تو دکن کی تاریخ (قطب شاہی خاندان، عادل شاہی خاندان) کا بھی مطالعہ کرتے ہیں، اسی طرح اُردو کی تشکیل میں جب مسلمان حکمرانوں (جیسے شہنشاہ اکبر) کا ذکر کرتے ہیں تو یہ ذکر ایک مخصوص تاریخی تناظر ہی میں ہوتا ہے۔ ایسا تاریخی تناظر جس میں مذہب اسلام (عربی زبان) تخلیقی روایات (فارسی زبان) کے حوالے بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس نوع کا تاریخی مطالعہ بالعموم ایک خاص تاریخی عہد تک ہی محدود ہوتا ہے لیکن قدیم ترین تاریخی ماخذ تک رسائی مقصود ہو تو پھر اسی مطالعہ میں بشریات (Anthropology)، قدیم مذہبی کتب اور اساطیر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے جن ماہرین نے اُردو زبان کا آغاز قدیم ویدک بولی (ڈاکٹر شوکت سبزواری) یا دراوڑی (عین الحق فرید کوٹی) میں تلاش کیا وہ اس

انداز کی بہت اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین 'عام لسانیات' میں لکھتے ہیں:

> ''جدید تاریخی وتقابلی لسانیات کی بنیاد سر ولیم جونز کے شکنتلا ناٹک کے ترجمے سے پڑتی ہے۔ اس کے سلسلے میں انہوں نے سنسکرت کا مطالعہ کیا اور پھر خیال ظاہر کیا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی بالیقین ایک ہی خاندان سے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ گوتھک اور کیلٹک بھی اسی خاندان سے ہیں۔ اس کے بعد سنسکرت اور دوسری کلاسیکی زبانوں کا مزید مطالعہ کرتے لفظوں کی مطابقتیں تلاش کی گئیں۔ اختلافات کی تاویل کے قاعدے قانون بنائے گئے اور اس طرح ہند یورپی خاندان کی مختلف زبانوں کا شجرہ تیار کیا گیا۔'' (ص ۱۴۳)

لسانیات کا ایک اور معروف انداز توضیحی (Descriptive) ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے اس میں زبان سے وابستہ مسائل کی توضیح، تشریح کی جاتی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا مگر جزئیات میں جداگانہ ایک اور شعبہ جو تجزیاتی (Analytical) لسانیات کہلاتا ہے اس میں زبان کی صورت پذیری کے اصولوں کے ساتھ ساتھ زبان کی حیثیت کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی صرف، نحو کا بھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور شاخیں بھی ہیں جیسے نفسیاتی لسانیات (Psycho-Linguistics)، عصری لسانیات (Synchronic Philology)، عصریاتی لسانیات (Diachronic Philology) وغیرہ۔ نفسیاتی لسانیات میں زبان کا مطالعہ کرتے وقت اس مخصوص نسل کے نفسیاتی کوائف بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں جس سے اس زبان کا تعلق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں نسلی وراثت کے قانون کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

موخر الذکر دو شعبوں کا تعلق زبان کے عصری یا زمانی مطالعہ سے متعلق ہے۔ ''اگر ایک زبان کی بولیوں کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اسے عصری بولی علم (Synchionic Philology) کہتے ہیں۔ اگر ان بولیوں کا تسلسل زمانہ میں مطالعہ و مقابلہ کیا جائے تو عصریاتی بولی علم کہیں گے۔ اس میں تاریخی اور تقابلی دونوں قسم کی لسانیات کو دخل ہوگا۔ بولی کا مطالعہ عموماً عصری لسانیات کی بجائے عصریاتی لسانیات کے تحت کیا جاتا ہے یعنی یہ تاریخی اور تقابلی مطالعے کے تحت آتا ہے۔ یہ ایک ہی خاندان کی زبانوں یا ایک زبان کی بولیوں کا ذکر تھا۔ اگر کئی بالکل مختلف خاندانوں کی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اسے نوعیات (Typology) کہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس مطالعے میں کوئی رشتہ تو قائم کیا نہیں جاتا صرف و نحو کو لے کر مشترک یا متضاد خصوصیات کی بنا پر گروہ قائم کئے جاتے ہیں۔ انہیں پہلے نحوی یا قواعدی گروہ بندی کہتے تھے اب نوعیاتی (Typological) گروہ بندی کہتے ہیں۔'' (ص ۲۲۸)

لسانیات کی جن اقسام کا تذکرہ ہوا، یہ سب مغرب میں مروج ہیں، جیسے جیسے علوم کے آفاق وسیع اور متعدد ہوتے گئے عناصر زندگی اور اس سے متعلق علوم، نظریات اور تصورات بھی ان سے متاثر ہوتے گئے۔ یہی حال لسانیات کا بھی ہوا کہ اگر ایک طرف مختلف علوم سے کسب نور کیا تو دوسری جانب سائنسی اصولوں سے بھی کسب فیض کیا۔ یوں علوم کی وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ (مغرب میں) لسانیات بھی پُرتنوع ہوتی گئی۔

آوازوں کا آرکسٹرا:

اپنی اساس میں حرف آواز ہے جو ہونٹوں، تالو اور حلق کی مختلف حرکات کے سبب مختلف لہجوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان ہی آوازوں کو مختلف شکلوں میں جب لکھا گیا تو حرف معرض وجود میں آیا۔ حروف کے باہمی ملاپ سے الفاظ بنے جنہوں نے تشبیہ، استعارہ، تمثال اور علامت کی صورت میں تخلیقی اظہار میں گہرائی، وسعت، تنوع اور روسعت پیدا کی۔

لسانی ماہر آوازوں کو بصورت حرف و لفظ مطالعہ کرتا ہے جبکہ موسیقی میں سرگم یہی کردار ادا کرتا ہے۔ سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی موسیقی کی اصطلاح ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھاد۔ سنگیت کے دوودانوں نے سرگم کو شدھ سُر قرار دیا یعنی یہ سُر خالص اور اسی لئے پورے ہیں مگر سرگم کے علاوہ مزید پانچ سُر اور بھی ہیں انہیں وکت (اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے) ان کے نام یوں ہیں: کومل رکھب، کومل گندھار، کومل دھیوت، کومل نکھاد اور تیور مدھم۔

سنگیت کی اصطلاح میں کومل نازک سُروں کو کہتے ہیں۔ یہ سُر نیچے کو جاتے ہیں جبکہ اوپر جانا یعنی چڑھتا ہوا سُر تیور کہلاتا ہے۔ سرگم کے پانچ سُر یا اوپر جاتے ہیں یا نیچے جبکہ کھرج اور پنچم اپنے مقام سے نہیں ہٹتے۔ یعنی نہ اوپر جاتے ہیں اور نہ نیچے۔ انہیں اچل (اپنے مقام پر قائم رہنے والا) کہتے ہیں۔

بظاہر سرگم کا زبان سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن ژرف نگاہی سے کام لینے پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی اساس میں زبان آواز ہے اور سنگیت بھی آواز ہی کا علم ہے۔ گویا آواز کی صورت میں زبان اور موسیقی مشترک اساس کے حامل ہیں۔

سُر سنسکرت کا لفظ ہے جس کا لغوی مطلب ناک سے خارج ہونے والی سانس ہے۔ یہ دراصل سرگم انسانی آواز کے ساتھ بنیادی انداز کا مطالعہ اور سنگیت کی اساس ہے۔ انسانی آواز موسیقی میں رفعت کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کر لیتی ہے جس کا اکمل ترین مظاہرہ ''خیال'' کی صورت میں ہوتا ہے۔

عام انسان عام زندگی میں ہر طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو دراصل ہر لفظ کی ادائیگی کی وقت وہ کام و دہن کی مدد سے مختلف النوع آوازیں ہی خارج کر رہا ہوتا ہے۔ سامع بھی چونکہ ایسی ہی آوازوں کا علم رکھتا ہے یا عادی ہوتا ہے اس لئے اظہار و ابلاغ میں دقت نہیں ہوتی۔ زبان غیر اسی لئے پلے نہیں پڑتی کہ کان اس زبان کی اصوات سے مانوس نہیں ہوتے اور ذہن ان اصوات سے بننے والے الفاظ کے مفہوم سے نا آشنا ہوتا ہے۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہ صرف موسیقی ہی میں ممکن ہے جو سُر تال کا جہان ہے اور جہاں زبان کا فن کارانہ استعمال اس میں لطافت پیدا کر دیتا ہے لیکن عام زندگی میں عام افراد کا مطالعہ اس کے برعکس ہے کہ انہوں نے ہر موقع محل اور ضرورت کے لحاظ سے ہر طرح کے اچھے بُرے، کرخت، ناملائم، بھونڈے، ثقیل الفاظ استعمال کرنا ہوتے ہیں۔ کتنے شیریں ہیں تیرے لب ..... یہ شاعرانہ بات ہے، عام زندگی میں کوئی بھی گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوگا۔ محبوب کی شیریں دہنی، مقرر کی شعلہ فشانی، رقیب کی بدزبانی، ماں کی لوری، باپ کی ڈانٹ، بزرگ کی نصیحت، بہی خواہ کی دعا، دشمن کی بددعا، شاعر کی سحر بیانی، داستان گو کی معجز بیانی، صوفی کا نعرۂ حق اور میری تیری لن ترانی ..... یہ اور ان سے ملتے جلتے مظاہر کیا ہیں؟ دراصل عام زندگی میں یہ زبان کے استعمال کے متنوع مظاہر ہیں۔ وہ زبان جس کی تشکیل جملہ یا فقرہ سے ہوتی ہے، جن کی اساس الفاظ بنتے ہیں، الفاظ حروف کے ملاپ کا ثمر ہیں جبکہ حروف صوت کے متنوع روپ ہیں، یوں دیکھیں تو زبان آوازوں کا آرکسٹرا قرار پاتی ہے۔

اُردو زبان کی سرگم:

آواز براہ راست اعصاب پر اثر انداز ہو کر ان پر اچھے برے، خوشگوار ناخوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے شیریں دہنی دراصل اصوات کی شیرینی ہے۔ جن الفاظ کو شیریں، ثقیل، کرخت کہا جاتا ہے تو یہ بھی الفاظ سے مشروط آوازوں کی بنا پر ہے۔ اسی انداز پر زبانوں کو نرم آہنگ یا بدآہنگ قرار دیا جا سکتا ہے۔ گویا موسیقی کی مانند زبان بھی کانوں اور اعصاب کا عمل ہے۔

سید عابد علی عابد مقالہ ''اُردو میں حروف تہجی کی غنائی اہمیت'' (تنقیدی مضامین، ص ۳۳-۳۱) میں رقم طراز ہیں:

"..... حروف تہجی کے گروہوں کی اندرونی ترتیب غلط ہے یعنی مان لیا گیا ہے کہ ہر گروہ کا ہر حرف ایک سُر ہے اب ان گروہوں کے سُروں کی ترتیب دیکھئے، الف تو چھوڑ دیجئے کہ حرف علت ہے..... پہلا گروہ دیکھئے: ب پ ت ٹ ث۔ مان لیجئے کہ یہ سُر ہیں تو فوراً واضح ہوگا کہ ب شدھ ہے پ تیو یا چڑھتا ہوا سُر ہے ت کومل یا اُترا ہوا سُر ہے۔ ٹ بہت چڑھا ہوا سُر ہے ث اُترا ہوا، آت کومل سُر ہے۔ ج چ ح خ۔ ج شدھ ہے۔ چ تیو رہے۔ ح کومل ہے خ آت کومل ہے۔ د ڈ۔ د شدھ ہے اور ڈ تیو رہے۔ ر اور ڑ کومل ہے۔ ڑ زڑ۔ ر شدھ ہے ڑ تیو رہے ز اور ژ آت تیو رہے۔ س ش شدھ اور تیو رہیں۔"

سید عابد علی عابد اس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

"..... سنگیت کے سُروں اور حروف تہجی کی تعداد میں ایک نایاب فرق بھی ظاہر ہوا اور وہ یہ کہ جہاں سنگیت فقط شدھ اور کومل سُروں کو پہچانتا ہے اور فقط ایک سُر کو یعنی مدھم کو تیو رمانتا ہے وہاں اُردو ہر گروہ میں علیحدہ علیحدہ شدھ اور تیو ر رکھتی ہے اور بعض گروہوں میں کومل اور آت کومل اور آت تیو رسُروں کو بھی پہچانتی ہے اور شاید اس اعتبار سے اُردو کے حروف تہجی تمام شرقی زبانوں سے زیادہ ارتقا یافتہ ہیں۔" (ص ۳۲)

گویا اُردو زبان بھی اپنی سرگم رکھتی ہے۔ یہ جداگانہ امر کہ ہم نے کبھی شعور طور پر اس کا ادراک نہ کیا ہو۔ شاعری کے مطالعہ میں بالعموم اور غزل کے مطالعہ میں بالخصوص ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس طرح کے الفاظ غنائیت، نغمگی، موسیقیت، نرم ریزی، خوش آہنگی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ اور اس نوع کے دیگر الفاظ دراصل زبان کی سرگم کی نشان دہی کرتے ہیں۔ خود استعمال کرنے والے کو شعوری طور پر اس کا احساس بھی نہ لیکن درحقیقت وہ موسیقی میں ہی بات کر رہا ہوتا ہے وہ موسیقی جو آت کومل سُروں کے حامل الفاظ سے مشروط ہوتی ہے۔ میں نے گیت کا اسی لئے نام نہ لیا کہ وہ تو ہے ہی گائے جانے کی چیز۔ موسیقی اور گیت جام و مینا کی طرح لازم و ملزوم ہیں۔ سنگیت کی آغوش میں گیت ہے۔ اچھے اور سمجھدار گیت نگار تو گیتوں کے لکھنے میں راگ راگنیوں کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔

نغمگی کی اعلیٰ ترین مثالیں میر تقی میر کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ ان کی طویل بحروں والی غزلیں نغمگی کی بہترین مثالیں ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"..... میر کی گیت نما غزلیں اتنی مترنم اور پُر لطف ہیں کہ ان کی پوری کیفیتوں کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے بعض درد کا اور بعض شوق کا اظہار کرتی ہیں۔ یعنی تمنا کا، بعض میں مسرت ہے جس کا اظہار بحروں ہی سے ہو جاتا ہے" (نقد میر، ص ۵۰)

چند مثالیں پیش ہیں:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے! پرے!

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا رونا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

کیا دل کش ہے بزم جہاں کی جاتے یاں سے جسے دیکھو
وے غم دیدہ، رنج کشیدہ، آہ سراپا حسرت ہے

بت تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

صوتیات:

ہمیں میر تقی میر کی طویل بحروں والی غزلوں میں ترنم کا احساس ہوا تو شعر نقل کر دیئے یہ ایک عام انسان کا رویہ ہے۔ لیکن ماہر یوں بات نہ کرے گا کہ مجھے ان اشعار میں ترنم کا احساس ہوا ہے وہ تو ایک ایک لفظ کا صوتی تجزیہ کرتے ہوئے غزل میں ''ترنم'' کی بنیاد دینے والی اصوات کا مطالعہ کرے گا۔ یعنی وہ صوتیات (Phonetic) کی اصطلاحوں میں بات کرے گا۔

صوتیات نسبتاً جدید علم ہے اور جیسا کہ اس اصطلاح کے معنی ہی سے واضح ہو جاتا ہے یہ الفاظ سے وابستہ اصوات کے مطالعہ کا علم ہے۔ دیگر علوم نظریات، تصورات کی مانند یہ بھی مغرب سے در آمد شدہ ہے اس لئے اس علم کی جملہ اصطلاحات انگریزی میں ہیں۔

صوتیات میں آلاتِ صوت کی ان تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو حرف/لفظ کی ادائیگی کے وقت وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ صوتیات کا ماہر نفوذ ایئت ENT سے بھی کچھ شُد بُد رکھتا ہو۔

ذیل میں صوتیات کی چند بنیادی اصطلاحات درج ہیں:

مصمتہ (Consonant)، مصوتہ (Vowels)، دوہرا مصوتہ (Diphthones)، کثیر الاستعمال مصمتہ (High Ranking Consonant)، انفی مصمتہ (Nasal Consonant)، انفیایا گیا مصوتہ (Nasalied Vowels)، ہکاری (Aspirated)، کوزی (Retroflex)، غیر مسموع (Voiceless)، مسموع (Voiced)، صفیری (Fricative)، صوتی حس (Euphony)، صوتی جمالیات (Phono-Resthetic)، مصمتی تکرر (Consonance)، آہنگ (Rhythm)، رکنِ صوت (Syllable)، صوتی علامت (Sound Symbolism)، انفی آواز (Nasal Sound)، سسکار آواز (Sibilant)، صوتیہ (Phoneme)، آواز کی ماہیت (Phonetics)، آواز لوعیت (Phonology)، آوازی کی اکائی (Phoneme)، آواز کی علامات (Semiotics)، معنویات (Semantics)۔

مندرجہ بالا اصطلاحات میں سے بعض تو واضح ہیں لیکن کچھ اصطلاحات کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ حلق سے جو آواز پیدا ہوگی اسے مصوتہ (Vowel) کہتے ہیں، جب ہوا صرف ناک سے خارج ہو کر آواز پیدا کرے تو وہ انفی (Nasal) ہوگی (م ن)۔ سانس کے تنگ راستے سے نکلنے سے پیدا ہونے والے آواز صفیری (Fricative) (ف، و، ز، ح، خ، س، ش، غ) کہلاتی ہے۔ اگر مصوتہ کے برعکس حلق سے ہوا کے اخراج میں کسی طرح کی رکاوٹ ہو تو اسے مصمتہ (Consonant) (ل، ر، م) کہتے ہیں۔ جب کسی مصمتے کی ادائیگی میں پھیپھڑوں پر ضرورت سے زیادہ زور پڑے تو اسے ہکاری (Aspirated) کہتے ہیں (اردو میں دو چشمی ھ والے تمام الفاظ ہکاری ہیں) جبکہ ٹ، ڈ، ڑ کوزی آوازیں ہیں۔

عام انسان ہو یا شاعر، ادیب، گفتگو یا تحریر میں شعوری طور سے کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ جو الفاظ استعمال کر رہا

ہے یا جن الفاظ سے وہ تخلیق کا جادو جگا رہا ہے اُن کی نوعیت کیا ہے۔ بات کی ادائیگی میں سانس کس طرح سے خارج ہوتی ہے تالو کیا کردار ادا کرتا ہے اور پھیپھڑے کتنا زور لگاتے ہیں، جبکہ صوتیات کی اساس ہی ان امور پر استوار ہے۔ اگرچہ یورپ میں اس ضمن میں خاصہ کام ہوا مگر ہمارے ہاں اس ضمن میں قابل توجہ کام نہ ہوا۔ ہندوستان میں اس سلسلہ میں سنجیدگی سے نظریاتی اور اطلاقی مقالات قلم بند کئے گئے صوتیات پر استوار علم اُسلوبیات ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

''......اسلوبیاتی تحریر میں ان لسانی امتیازات کو نشان زد کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کسی فن پارے، مصنف، شاعر، ہیئت، صنف یا عہد کی شناخت ممکن ہو۔ یہ امتیازات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں (۱) صوتیاتی (آوازوں کے نظام سے جو امتیازات قائم ہوئے، ردیف و قوافی کی خصوصیات یا سکوییت، ہکاریت یا نخیت کے امتیازات یا مصموتوں اور مصوتوں کا تناسب وغیرہ) (۲) لوعیاتی (خاص نوع کے الفاظ کا اضافی تواتر، اسماء، اسمائے صفت، افعال وغیرہ کا تواتر اور تناسب، تراکیب وغیرہ) (۳) نحویاتی (کلمے کی اقسام میں سے کسی کا خصوصی استعمال، کلمے میں لفظوں کا دروبست وغیرہ) (۴) بدیعی (Rhetorical) بدیع و بیان کی امتیازی شکلیں، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل، علامت، امیجری، وغیرہ (۵) عروضی امتیازات (اوزان، بحریں، زحافات وغیرہ کا خصوصی استعمال اور امتیازات)'' (ادبی تنقید اور اسلوبیات، ص ۱۷)

سنسکرت شعریات اور صوت:

صوتیات کے تصورات اُردو میں دیگر تصورات اور اصطلاحات کی مانند مغرب سے درآمدہ ہیں۔

علمی تصورات کی تاریخ کے مطالعہ میں بعض اوقات اس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جسے جدید سمجھا جا رہا تھا ماضی میں اس کے ابتدائی نقوش دستیاب ہیں چنانچہ حرف و آواز کے سلسلہ میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ سنسکرت کے قدیم دودان اس سے آگاہ تھے ہم کیونکہ انگریزی پڑھتے اور اس کے حوالہ سے بات کرتے ہیں اس لئے ہمیں یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ بعض اوقات ''جدید'' کتنا قدیم ثابت ہوتا ہے۔ اب صوتیات ہی کو لے لیجئے جسے جدید علم مانا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت زبان کے دودان اس سے واقف تھے۔ پانینی (Paneny) نے اصوات کے اصول مرتب کئے بلکہ صوتیات کی تعریف و تشریح میں اس نے جو تصریحات کیں وہ آج بھی کارآمد ہیں۔ پانینی نے ۳۰۰ قبل مسیح لاہور میں جنم لیا۔ اشوک کے عہد کی مشہور ٹیکسلا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ اسے سنسکرت زبان کا سب سے بڑا عالم اور گرامیرین تسلیم کیا جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی:

''وہ ماہر لسانیات جس نے اُردو کی صوتیات کا علمی تجزیہ کیا، پانینی ہے جو ٹیکسلا کا رہنے والا تھا۔ جدید ماہرین لسانیات نے تسلیم کیا ہے کہ صوتیات کے بہت سے بنیادی اصول جن کو آج بھی جدید لسانیات کی تشریح و تفہیم کے سلسلے میں اختیار کیا جاتا ہے پانینی کے مرہون منت ہیں۔''

(بحوالہ مقالہ ''اُردو کا لسانی سرمایہ'' از عائشہ سعید، دریافت، شمارہ ۴، اگست ۲۰۰۷ء)

''سنسکرت شعریات'' کے مولف عنبر بہرائچی کے بموجب ''سنسکرت شعریات میں نظریہ صوت کو باقاعدہ پیش کرنے کا کارنامہ آچاریہ آنند وردھن نے نویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنی مشہور تصنیف دھونیا لوک کے ذریعے انجام دیا......دھونیا لوک کے آغاز میں ہی آچاریہ آنند وردھن نے ایک اہم جملہ کہا ہے شعر کی روح دھون (صوت) ہے۔'' (ص ۱۶۸)

دھون (صوت) کے سلسلہ میں وروالوں نے خاصی نکتہ طرازی کی ہے۔آج ہم صوت کو آواز صوت سے مشروط گردانتے ہیں جبکہ آچاریہ آنندوردھن جسم میں صوت کی تشکیل کے چار مدارج یا درجات کا ذکر کیا ہے۔ا۔ ہوا'' ہوا کی طاقت سے شکم میں جس کلام کا آغاز ہوتا ہے اسے پرادرک کہا جاتا ہے۔ ناف کے نزدیک جب کلام پہنچ کر آگے بڑھتا ہے تو اسے پشینتی واک کہا جاتا ہے، دل کے نزدیک جب کلام پہنچ کر آگے بڑھتا ہے تو اسے مدھما واک کہا جاتا ہے اور اسی کو سپھوٹ بھی کہا جاتا ہے۔ جب کلام قلب سے آگے بڑھ کر زبان، تالو اور حلق سے ٹکراتا ہوا باہر ظاہر ہوتا ہے تو اسے ویکھری واک کہا جاتا ہے۔سپھوٹ کی حالت یعنی مدھما واک کی حالت میں کبھی لفظوں کے معانی ایک ہوتے ہیں لیکن وہ مختلف اصوات کے ذریعہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اس لئے سنسکرت صرف ونحو میں ویکھری واک ہی کو دھون کہا گیا ہے۔'' (ایضاً، ص ۱۸۳)

آچاریہ آنندوردھن نے یہ دلچسپ بات کی ہے انسانی جسم میں صوت کا سفر اب آلات صوت سے مشروط ہے۔ایک ایک حرف کے تکنیکی مدارج کا تعین کیا جا چکا ہے مگر ڈیڑھ ہزار برس قبل اتنا کہہ دینا بھی بڑی بات ہے اسی طرح یہ کہنا بھی قابل توجہ ہے:

> ''مدھیما واک کی حالت میں کبھی لفظوں کے معانی ایک ہوتے ہیں لیکن وہ مختلف اصوات کے بعد مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔''

یعنی یہاں بھی ہونٹوں، تالو اور حلق کی اس کارکردگی کی طرف اشارہ کیا جارہا جو سادہ صوت کو حروف کی شکل دیتی ہے۔
اس ضمن میں ایک اور دلچسپ امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے:

> ''آنندوردھن سے قبل قدیم ہندستانی فلسفے کے مہورت میں قوت لفظ کے بارے میں کافی غور وخوض کیا جا چکا تھا اور سنسکرت صرف ونحو کے ماہرین نے بھی لفظ کی قوت پر کافی غور وخوض کیا تھا اور انہوں نے پایا کہ حرف اور لفظ کا جز و زبانی ادائگی کے فوراً بعد ختم ہو جاتے ہیں اس لئے ان کا زمرہ حلق نہیں ہو پاتا جبکہ صورت حال یہ ہے کہ انجذ معنی کے لئے زمرہ کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ حرف کا زمرہ ہو چاہے جزوں کا...... متکلم جو لفظ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اس کے سارے حروف کو ایک ساتھ ادا نہیں کرسکتا مثلاً لفظ تاب کو ادا کرنے میں متکلم سب سے پہلے ت کو ادا کرے گا پھر ا کو پھر ب کو ادا کرے گا۔ واضح ہو کہ جب وہ ب کو ادا کرے گا تو اس لمحے ت اور ا کی ادائگی موجود نہیں رہے گی۔''ت''، ''ا'' اور ''ب'' ادا ہوتے ہی فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملنے کا انتظار کئے بغیر اپنا وجود غیاب میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس لئے سنسکرت صرف و نحو کے علماء نے انہیں عارضی یا لمحاتی مانا اور ایک دائمی لفظ کا تصور پیش کیا جس سے معنی آفرینی ہو اسی لفظ کو انہوں نے سپھوٹ کا نام دیا۔'' (ایضاً)

اس پر اولین اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب زبان سے ادائگی کے وقت انفرادی طور پر ہر ہر حرف فضا میں تحلیل ہوتا جاتا ہے تو پھر مکمل لفظ کے معنی کا ادراک کیسے ممکن ہوگا۔اسی کے جواب میں یہ کہا گیا:

> ''لفظ کا ہر حرف ادا ہوتے ہی فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے پس وہ غائب ہونے پر بھی سامع کے قلب وذہن پر اپنے اثرات مرتب کر جاتا ہے کیونکہ سامع نے لفظ کے ہر حرف کو الگ الگ سنا ضرور ہے اس لئے یہ لفظ کے ہر حرف کی بتدریج سماعت، لفظ کے معنی کا ادراک کراتی ہے۔ظاہر ہوا کہ لفظ دو طرح کے ہوتے ہیں ، ایک دائمی اور دوسرا عارضی۔ دائمی لفظ ظاہر نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ ہمارے قلب میں موجود رہتا ہے جبکہ عارضی لفظ ظاہر ہوتا ہے اور وہ زبان سے ادا ہوتے ہی فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ترتیب یافتہ دائمی لفظ، عارضی لفظ کے خصوصی ٹکراؤ سے جاگ پڑتا ہے۔یہی عمل ہی سپھوٹ ہے جسے دھون بھی کہا گیا ہے۔'' (ایضاً، ص ۱۸۵)

صوت کے حرف بننے اور پھر حروف کے مل کر لفظ بننے کے بارے میں جس عمل کی نشان دہی کی گئی شاید وہ میڈیکل کے

مطابق درست نہ بھی محسوس ہو لیکن ڈیڑھ ہزار برس قبل اتنی سوچ بھی قابلِ توجہ ہے۔ اور یہ کہ ہر حرف ادا ہوتے ہی فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے تو اگر چہ یہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن اس ضمن میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کسی لفظ کے پہلے حرف کی مانند آخری حرف بھی تو فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے یعنی ناپ کے حرف ت اور ا ہی نہیں بلکہ پ بھی فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔ تو پھر سوال ہے کہ فضا میں تحلیل ہوتی ان منفرد آوازوں سے لفظ کیسے تشکیل پا جاتا ہے۔

میرے خیال میں اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوائل عمر ہی سے آلاتِ صوت اور اعضاب کی اُن تمام آوازوں سے کنڈیشننگ ہو جاتی ہے جو حرف بن سکتی ہیں اس لئے انفرادی طور پر حروف کی صوت فضا میں تحلیل ہو جانے کے باوجود بھی آلاتِ صوت اور اعضاب پر ان کے ''نقوش'' مرتسم رہتے ہیں جو اسے حرف کے ''عدم'' (فضا میں تحلیل ہو جانا) کے باوجود بھی حرف ''موجود'' رہتا ہے بالکل ایسے جیسے کسی آواز/سوز/موسیقی/دھماکے کے بعد بھی کچھ دیر تک کان اسے ''سن'' سکتے ہیں۔ سینما کی فلم کی مثال بھی اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ سینما کی فلم میں ہر فریم کے بعد فلم کا چھوٹا سا حصہ خالی ہوتا ہے یعنی ایک فریم اس کے بعد خالی حصہ اور پھر دوسرا فریم۔ لیکن پروجیکٹر پر فلم اس تیزی سے چلتی ہے کہ آنکھوں کو وقفہ کا احساس ہی نہیں ہوتا یوں ساکت ہونے کے باوجود آنکھ کو مناظر متحرک نظر آتے ہیں۔

لسانیات - ایک سائنس:

کیا لسانیات سائنس ہے؟

یہ سوال مغربی ماہرین میں موضوعِ بحث بنا رہا ہے، ہمارے ہاں یہ بحث اس لئے نہ چھڑی کہ مغرب سے تقابل کے نتیجہ میں اُردو لسانیات خاصی محدود نظر آتی ہے۔

ژرف نگاہی سے دیکھیں تو لسانی تحقیق کا طریقِ کار سائنسدان سے مشابہ نظر آتا ہے۔ حصولِ مواد اور اس مواد میں سے معروضی طور پر حقائق کی تلاش، حقائق کا غیر حقائق (مفروضوں، افواہوں، کلیشے، تعصبات، مسلمات، روایات، تقلید، سند) سے امتیاز، اپنی پسند ناپسند سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تحقیق سے مستخرج ہونے والے نتائج کو درست تسلیم کرنا۔ بے جا ضد سے پرہیز، غیر مدلل، منطقی اور غیر جذباتی رویہ، پہلے سے طے شدہ نتائج کو ہمیشہ ہی درست تسلیم نہ کرنا اور اس کی تحقیقی مساعی کے نتائج (اگر اپنے نظریات کے برعکس ہوں) کو بھی کھلے دل سے قبول کرنا یا کم از کم ان پر معروضی انداز میں غور کرنا۔

سائنسی تحقیقات کا یہی انداز ہے اور یہی انداز لسانی محقق بھی اپناتا ہے اس لئے لسانیات کو سائنس قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر چہ اُردو لسانیات میں لیبارٹری اور آلات نہیں ہوتے جو کسی بھی سائنسی تحقیق کے لئے ضروری ہیں لیکن اب کمپیوٹر کی مدد سے Voice Lab سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ کتب خانوں میں کیٹلاگ کارڈز کی جگہ کمپیوٹر سے کام لیا جا رہا ہے جبکہ کتابیات بھی کمپیوٹر سے تیار کی جا رہی ہے۔ کمپیوٹر لغت سازی میں بھی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ الغرض اب اُردو لسانیات میں بھی کمپیوٹر اور دیگر آلات سے مدد لی جا سکتی ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر عطش درانی مقالہ بعنوان ''اُردو لسانیات کی جدید حدود و قیود'' (''اخبار اُردو''، اکتوبر ۲۰۰۷ء) میں اُردو لسانیات کو عہدِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''لسانیات دورِ جدید کی حاضر اور مستعمل زبان اور آئندہ تبدیلیوں کے مطالعہ کا نام ہے۔ اسے معاصری (Synchronic) لسانیات کہا جاتا ہے۔ لسانیات کا دوسرا حصہ نظری (Theorotical) کہلاتا ہے۔ اس کا تعلق زبان کے انفرادی مطالعے اور اس کے علمی پہلو سے ہے جو اطلاقی لسانیات میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ تیسرا پہلو سیاقی اور آزاد (Contextual and Independent) ہے یعنی کوئی زبان دنیا

میں کہاں فٹ ہوتی ہے اور اس کا سماجی وظیفہ کیا ہے یہ کیسے پروان چڑھتی ہے اور کیسے عمل پذیر ہوتی ہے اور اس کی آزاد صورت، قواعد اور لغات ہی کیونکر سامنے آتی ہے۔ لسانیات کا تحقیقی دائرہ بھی کئی دوسرے علوم کو نگل چکا ہے جیسے تاریخ، سماجیات، لفظیات، بشریات، اعصابیات، ریاضی اور کمپیوٹر سائنس وغیرہ۔"

ڈاکٹر عطش درانی بتاتے ہیں کہ" .....فلالوجی کی پہلی انجمن ۱۸۸۰ء میں جان ہاپکنز یونیورسٹی میں قائم ہوئی۔ فنی تنقید (Textual Criticism) اسی فلالوجی کا حصہ تھی .....لسانیاتی تلفظ کے قوانین کوئی ۱۸۰۷ء میں وضع ہو گئے تھے جنہیں گرم کا قانون (Grimm's Law) کا نام دیا جاتا ہے .....ہم فرہنگ تلفظ شائع کرنے کے باوجود ایسی کسی وضع سے محروم ہیں ورنر (Verner) کا قانون، شیمبو (Stammbao) کا نظریہ، ویلین (Veluen) کا نظریہ اور جدید لسانیات کے بانی فرڈی ننڈ سا سور کو تو ہم نے کہاں جانا (بہر طور فیشن لوم چومسکی (Noam Chomsky) کا ذکر کرتے ہیں جن سے آگے اب ذیلگ ہیرس (Zellig Harris) لیوا رڈ بلوم فیلڈل کر ایک مکتب فکر بناتے ہیں جو زبان اور تحریر کا قائل نہیں۔"

اُردو صوتیات کے فن میں پیش رو کام کرنے والوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نام بہت اہم ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر "ڈاکٹر زور" میں لکھتی ہیں کہ" انہوں نے صوتی آلات کی مدد سے اصوات کا باقاعدہ مطالعہ کر کے جو نتائج مرتب کئے تھے انگریزی میں "ہندوستانی فونیٹکس (Hindustani Phonetics) کے نام سے موسوم کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی .....اُردو کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر زور کی اولیت مسلمہ ہے۔ انہوں نے اپنی اس تصنیف میں اُردو کے مخصوص صوتیے (Phonems) کے مخرج اور ادائیگی کو ظاہر کرنے کے لیے تصاویر اور ڈائیگرام (Diagram) سے بھی مدد لی ہے (ص ۱۹۹) .....۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر زور نے "ہندوستانی صوتیات" کے متعلق جو نتائج اخذ کئے تھے اُردو دان طبقہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھے اور پہلی مرتبہ صوتیات پر لکھی ہوئی کسی باقاعدہ تصنیف سے روشناس ہوئے تھے لندن اور پیرس کی تجربہ گاہوں میں اصوات کا تجزیہ کرنے کے جو آلات اس زمانہ میں موجود تھے ان کی مدد سے ڈاکٹر زور نے ہندوستانی کا تجزیہ کیا تھا۔" (ص ۱۲۲) "ڈاکٹر زور اُردو کے وہ پہلے ماہر صوتیات ہیں جنہوں نے سائنسی آلات اور پیلوٹوگرام (Plato Gram) کی مدد سے اصوات کی ادائیگی کو باضابطہ طور پر ظاہر کیا ہے۔ پیلوٹوگرام تالو کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو مختلف آوازوں کے مخرج کے مقام کو ظاہر کرتا ہے۔ ڈاکٹر زور کا ایک علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے آوازوں کے اختلاف کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ اور سائنسی آلات کی مدد سے ظاہر کیا ہے اور اس مقصد کے لئے کائموگراف سے بھی مدد لی ہے۔" (ص ۱۲۳) "گیان چند جین نے ڈاکٹر زور کو اُردو لسانیات کا "ابوالآبا" کہا ہے جو بہت مناسب اور درست معلوم ہوتا ہے۔" (ایضاً، ص ۱۲۸)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد اس ضمن میں کام کرنے والوں میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مرزا خلیل احمد بیگ اور مغنی تبسم کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اُردو لسانیات:

جہاں تک اُردو لسانیات کا تعلق ہے تو اس میں اس تنوع کا فقدان نظر آتا ہے جس سے (مغرب میں) لسانیات کے مباحث میں رنگ افروزی ملتی ہے۔ ہمارے تمام لسانی محققین نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو اُردو کے آغاز، نام، صورت پذیری سے وابستہ مسائل و مباحث کے لئے وقف کئے رکھا۔ دنیا کی جتنی بڑی زبانیں ہیں وہ ملک یا نسل سے مشروط ہیں اس لئے وہاں زبان کے آغاز میں نہ تو کوئی پیچیدگی اور الجھن ملتی ہے اور نہ ہی کام کے سلسلے میں موشگافیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو نام ملک کا ویسا زبان کا۔ فرانس کی فرانسیسی، عربوں کی عربی، یونان کی یونانی، جرمن کی جرمنی، سپین کی سپینش وغیرہ۔ لیکن ہندوستان کی مناسبت سے ہندوستانی نام نہ چلا اس طرح پاکستان کی مناسبت سے زبان پاکستانی نہ کہلائی۔

جن پیچیدہ تہذیبی عوامل، ثقافتی اثرات، تاریخی صورت حال اور مذہبی اقدار کے امتزاج نے صدیوں کے بعد رابطہ کی زبان تیار کی ان کا مطالعہ یک جہت نہیں بلکہ اس فن میں متعدد عوامل اور پُر تنوع محرکات کا مطالعہ درکار ہے۔

اگر چہ کسی زمانہ میں زبان کے لئے زبانِ ہندوستان کا استعمال ہوتا رہا ہے ملا وجہی معروف تمثیلی قصے ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) میں لکھتے ہیں:

''آغاز داستان بہ زبانِ ہندوستان''

اسی طرح انگریزوں نے ملک کے نام پر ہندوستانی / اینڈوستانی کہا۔ اسی انداز پر گاندھی اور کانگریس نے زبان کے لئے ہندوستانی کا لفظ تجویز کیا مگر اس تجویز کو پذیرائی نہ ملی اور زبان اُردو ہی کے نام سے مقبول رہی اور اسی اُردو کے نام کے سراغ میں محققین تحقیقات میں ماضی میں بہت دور تک گئے۔

اُردو لسانیات کا سارا سرمایہ اُردو کے آغاز اور تشکیلی مراحل کی نشان دہی سے عبارت ہے۔ اُردو لسانیات میں جتنے بھی بڑے ماہرین اور محققین ملتے ہیں وہ سب اُردو کے آغاز کے بارے میں نظریہ ساز تھے لیکن اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والوں کے پاس مزید کہنے کو کچھ نہیں رہا تو اُردو لسانیات اب مشکل کا شکار نظر آتی ہے نہ نیا نظریہ نہ نظریہ ساز۔ باقی کیا بچا ..... بجھے چراغوں کا دھواں!

پان کی گلوری!

کسی کلچر میں زبان کا بننا اور بات ہے اور زبان کے اپنے کلچر کی اور بات ہے۔ جس طرح معاشرہ سے مخصوص کلچر ہوتا ہے اسی طرح زبان کا بھی کلچر ہوتا ہے جو اسی سے مخصوص ہوتا اور ایک زبان کو دیگر زبانوں سے ممتاز، منفرد اور متمیز کرتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ یہ زبان ملائم ہے یہ کرخت ہے اور یہ Rich ہے تو ایسا دراصل اس زبان کے کلچر کی بنا پر ہوتا ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ جرمنی فلسفہ کی زبان ہے انگریزی کاروبار کی اور فرانسیسی عشق کی زبان ہے تو یہ بھی زبان کے مخصوص کلچر کی بات ہے۔ ہم کہتے ہیں عربی مذہبی زبان ہے، فارسی تہذیبی اور اُردو غزل کی تو یہ بھی ان زبانوں سے مخصوص کلچر ہی کی بات ہے جو زبان کے تشخص اور شناخت کا باعث بنتا ہے۔

زبان کے کلچر کی تشکیل صدیوں پر محیط تاریخی، تہذیبی، تمدنی، اقتصادی، روحانی اور تخلیقی عوامل سے مشروط ہوتی ہے۔

قوم یا نسل مخصوص جغرافیائی حدود میں ہوتی ہے لہٰذا اس کا لینڈ سکیپ بھی اہم ثابت ہوتا ہے۔ خوش منظر وادی کے نرم خو باشندوں اور چٹیل پہاڑوں کے جفاکش لوگوں کی زبان میں فرق ملے گا۔ وہی ان کی زبانوں کے کلچر میں حد فاصل کا کام کرے گا۔ کسی نے طنزاً کہا اُردو تو پان کھانے والوں کی زبان ہے۔ تو برا ماننے کی ضرورت نہیں کہ پان دراصل اُردو کے امتزاجی کلچر کی علامت ہے۔ جب پان کے پتہ پر کتھا، چونا، سپاری، سونف، قوام (اور کبھی کبھار تمباکو) رکھ کر اسے لپیٹتے ہیں تو پان کا پتہ گلوری میں تبدیل ہو کر نیا تشخص حاصل کرتا ہے جسے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر خوب صورت بنا دیا جاتا ہے۔

اُردو زبان کو بھی ایسی ہی گلوری سمجھنا چاہئے جو مختلف زبانوں اور بولیوں کے امتزاج سے صورت پذیر ہوئی۔ جس طرح پان میں کتھا چونا سب انفرادی ذائقہ گھل کر مشترک ذائقہ اختیار کرتے ہیں ایسا ذائقہ جس میں اجزاء معدوم ہو کر ایسے ذائقہ کی تشکیل کرتے ہیں جو بالکل نیا، انوکھا اور منفرد ہوتا ہے۔ بس یہی اُردو زبان کا عالم ہے۔ جس میں نہ صرف ہندوستان کی تمام اور بولیوں کا رس شامل ہے بلکہ اب تو دنیا کی متعدد زبانوں (بالخصوص انگریزی) کے لاتعداد الفاظ ہمارے لہجہ میں گھل مل کر اُردو ہی کے ہو چکے ہیں۔

کلچر کے بارے میں اکیڈمک بحث سے احتراز کرتے ہوئے سادہ سی بات کی جاتی ہے۔ مجموعی کلچر دو طرح کا ہوتا ہے

وحدت (Uni) کا کلچر اور کثرت (Multi) کا کلچر۔ پاکستان میں کیونکہ ایک مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے سارا وحدت کا کلچر ہے جبکہ امریکہ میں دنیا بھر کے مذاہب، زبانوں، تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے افراد آباد ہیں اس لئے امریکہ میں کثرت کا کلچر ہے۔ وحدت کے برعکس کثرت کے کلچر کی اساس رواداری، برداشت، تحمل، انفرادی آزادی، پر استوار ہوتی ہے۔

اس مثال کو اُردو پر منطبق کرنے پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو بھی وحدت کے برعکس کثرت کے کلچر کی مظہر ہے اور اسی لئے یہ ہر زبان کے الفاظ و محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات کا کھلے بازوؤں سے استقبال کرتی ہے جو اُردو کے امتزاجی مزاج کے عین مطابق ہے اس لئے جو غیر ملکی لفظ اُردو میں آیا اس کو سینے دامن میں آسودہ ہوا۔ اس کے برعکس رویہ فرانسیسی اور فارسی میں انگریزی لفظ کا استعمال قابل تعزیر ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اُردو نے دوسری زبانوں سے جو الفاظ مستعار لئے بعض اوقات اُردو میں ان کے وہ معانی مروج ہو گئے جو اصل اور لغوی معنی کے برعکس تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن صرف ایک مثال پیش ہے۔ ہم سید/سیدی آلِ رسول کے لیے کلمۂ احترام کے طور پر استعمال کرتے ہیں جبکہ عربی میں اس کے برعکس یہ الفاظ صرف جناب، محترم اور محترمہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے عرب سیّد جارج بش اور سیّدہ کونڈولیزا رائس لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ دوبئی جانے کا اتفاق ہو تو واش روم دیکھئے جہاں دروازے پر السید (Male) اور السیدات (Female) لکھا ہوگا۔

عربی فارسی اور دیگر زبانوں کے متعدد ایسے الفاظ ملتے ہیں اُردو میں جن کے وہ معانی نہیں جو اس زبان میں ان کے لغوی معنی ہیں۔ زبان میں طہارت پسندی کے قائل حضرات اس پر اعتراض کرتے ہیں لیکن اعتراض کرنے والے یہ امر فراموش کر دیتے ہیں کہ اُردو کے مزاج کے مطابق جو لفظ جس معنی میں مروج اور مقبول ہو گیا وہی درست ہے کہ ویسے وہ اُردو کے کلچر کا حصہ بن چکا ہے یوں دیکھیں تو دخیل الفاظ اور غریب الفاظ کی بحث ہی بے کار ثابت ہوتی ہے۔ دیکھئے اس ضمن میں دریائے لطافت میں انشاء اللہ خاں انشاء نے کیا اچھی بات کی:

> ''جو لفظ اُردو میں مشہور اور مستعمل ہو گیا، خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اپنے اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ بہر حال اُردو ہے اگر اصل کے موافق استعمال ہو تو صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کا صحیح ہونا اُردو کے استعمال پر منحصر ہے۔ اس لئے کہ جو لفظ اُردو کے مزاج کے موافق نہیں ہے خواہ اصل کے لحاظ سے درست کیوں نہ ہو اور جو چیز اُردو کے مزاج کے موافق ہو وہ صحیح ہے خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو۔''

سنسکرت کی مانند اُردو ''دیوبانی'' نہیں۔ عوام نے اسے جنم دیا اور یہ عوام کے لئے ہے۔ اس کا مزاج امرا کے برعکس جمہوری ہے۔ ایسا جمہوری مزاج جس میں کثرت کا کلچر رنگ آمیزی کا باعث بنتا ہے۔

اُردو کے لئے مگوری کا استعمال ملحوظ رکھیں تو پھر چاندی کا ورق زبان کے متنوع تخلیقی استعمالات کا مظہر ثابت ہوتا ہے وہ تخلیقی استعمال جو جملہ تخلیقی اصناف میں سرخ لہو کی مانند جاری رہتا ہے۔ جہاں تخلیق کی صورت میں زبان ترفع حاصل کرتی ہے وہاں گالی کی صورت میں انسانی شخصیت کے پست پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے اس صورت میں مگوری پر سے چاندی کا ورق اُتر جاتا ہے۔ کھا جا اپنا فلیور گنوا دیتے ہیں اور تر و تازہ مگوری گندگی اور غلاظت سے پُر نظر آتی ہے۔ گالی کو زبان کے کلچر میں ''تحت کلچر'' (Sub-Cultur) قرار دیا جا سکتا ہے۔